مذہب کا قرآنی تصوّر

ڈاکٹر ابصار احمد

اہل علم کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ مختلف تہذیبی اور ثقافتی الفاظ و تصورات ایک خاص روایت سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا ایک مخصوص زبان سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور بالعموم ان کا مفہوم کسی دوسری زبان کے ایک لفظ میں کماحقہ منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ معاملہ بدرجہ اتم لفظ "مذہب" کے ساتھ ہے۔ جو چونکہ ماخذ کے اعتبار سے قرآنی الاصل نہیں، اس لیے اسلام کے ابتدائی دَور میں ہمیں اس کا استعمال نہیں ملتا لیکن جب قانونی اور فقہی معاملات پر مختلف فقہاء کی آراء سامنے آئیں تو انہیں اس کے پیش کرنے والے کی نسبت سے ایک مذہب کا نام دیا گیا۔ مثلاً مذہب حنفی، مذہب شافعی، مذہب مالکی وغیرہ جو بالترتیب امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک کے فقہی مسلک پر استوار ہوئے۔ چنانچہ ان معنوں میں شروع شروع میں مذہب مسلک کا ہم معنی تھا اور بس۔ جبکہ اسلام کے لیے اصلاً قرآنی اصطلاح "دین" مستعمل تھی۔ جس کا مفہوم بہت وسیع اور ہمہ گیر بھی ہے اور نہایت گہرا اور وسیع الذیل بھی۔ تصورِ خدا اور دیگر مابعد الطبیعیاتی عقائد سے لے کر انسانی زندگی کی انفرادیت اور معاشرت کے تمام پہلو اس کے اجزاء ہیں۔ عیسائی دنیا میں اس کے برعکس چونکہ ابتدائی سوا سو سال کے دوران ہی سیدنا حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں بگاڑ اور تحریف سے دین کا یہ ہمہ گیر تصور باقی نہ رہ سکا۔ اس لیے انھوں نے دین کو صرف عبادات اور عقائد تک محدود کر دیا یعنی زندگی کے صرف وہ جزوی معاملات جن کا تعلق چند رسمی عبادتوں (Prayers & Rituals) اور کچھ عقائد سے ہے۔ جس کے لیے انگریزی کا لفظ 'Religion' استعمال کیا گیا۔

اسلام جب برصغیر ہندوستان میں پہنچا، تو جہاں اس کی بنیادی تعلیمات اور تصورات میں اور تبدیلیاں ہوئیں، ایک تبدیلی عملاً یہ بھی واقع ہوئی کہ اس خطے میں 'دین' کی بجائے 'مذہب' کا لفظ زیادہ رائج اور مستعمل ہوا۔ جب انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے تو انہوں نے 'مذہب' کو اپنے ہاں کی مروجہ اصطلاح Religion سے تعبیر کیا۔ اور اس طرح لفظ 'دین' کبھی ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔ حتیٰ کہ اس صدی کے آغاز میں جب مختلف ملکوں میں اسلامی احیائی تحریکیں اٹھیں تو انہوں نے قرآنی دعوت اور اسلامی

افکار کی تشہیر کی، تب یورپی اقوام کو احساس ہوا کہ اسلام سے مسلمانوں کی مراد صرف مذہب نہیں ہوتی بلکہ اس کا اصل مفہوم قرآنی اصطلاح میں "دین" کا ہے جس کے لیے بعد ازاں بہت سے مغربی مفکرین اور مستشرقین نے 'A Complete code/way of Life' کی مفصل تشریحی اصطلاح استعمال کی۔

اس ابتدائیے سے سامعین پر یہ واضح ہو جائے گا، کہ اس مقالے کے عنوان میں اگرچہ میں نے 'مذہب' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن اس سے میری مراد 'دین' ہے۔ قرآنی تعلیمات کی رو سے مذہب کا کیا مفہوم ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لیے لفظ "اسلام" ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کا ایک مفہوم امن اور آشتی ہے۔ امن، آشتی، چین اور سکھ کو ہم مثبت اقدار کی حیثیت سے ایک بہتر اور آئیڈیل زندگی سے منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ زندگی کا مقصد بہتر زندگی بسر کرنا یا بالفاظ دیگر فلاح و بہبود ہے۔ فرض نمازوں کے لیے دن رات کے مختلف اوقات میں مؤذن پکارتا ہے کہ نماز کی طرف آؤ! فلاح کی طرف آؤ! مقصد حیات خود حیات ہے اور وہ اس طرح بسر کرنی چاہیئے کہ تدریجاً پاکیزہ، صالح، ہم آہنگ، آراستہ، مستحکم اور بلند تر ہوتی رہے۔ زندگی کا مقصد لطف اندوز ہونا یا محض مصائب برداشت کرنا نہیں بلکہ زندگی اس طرح بسر کرنا ہے کہ ہر فرد اہمیں امروز سے بہتر حالت میں پائے۔ اصلاح ذات حیات کا حقیقی مقصد ہے ظاہر و باطن میں حیات تصادمات سے معمور ہے اور اس کا ہر پہلو ایک رزمگاہ ہے۔ خیر و شر، یا خوب تر سے خوب کی باہمی آویزش انسانی وجود کی لازمی اور ناگزیر حقیقت ہے۔ حیات اپنی مظہری ترتیب میں ہم آہنگیوں اور بے آہنگیوں دونوں کو پیش کرتی ہے۔ انسان کے وجود کی غایت اور تمام اخلاقی کش مکش کا مقصد ان بے آہنگیوں پر غالب آنا ہے یا تو انہیں درست کیا جائے یا پھر انہیں ختم کر دیا جائے۔ امن کا آرزو مند ہونا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس لیے ہر وجود اسلام یا امن کا آرزو مند ہوتا ہے امن، خوشحالی اور مسرت یہ تینوں ایک ہی حالت کے مختلف نام ہیں۔

لفظ 'اسلام' کا دوسرا مفہوم تسلیم و خود سپردگی ہے جو پہلے مفہوم سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ یہ اس حالت کی تعریف کرتا ہے جس میں امن بطور صلہ حاصل ہو چکا ہو۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم سے جو تسلیم و اطاعت کے لیے کہا جاتا ہے تو یہ سر اطاعت کس کے آگے خم کیا جائے؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ تسلیم و اطاعت خدا کے لیے ہے اور پھر خدا کی تعریف یوں کرتا ہے کہ وہ جس کی اطاعت کی جاتی

چاہیئے چنانچہ خدا کا تصور اگر محدود یا غلط ہوگا تو پھر اطاعت کا انداز بجائے فلاح وبہبود کی طرف لے جانے کے زندگی کو محدود اور فتنہ وفساد کی آماجگاہ بنا دے گا۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہر پرستار اپنی موضوع پرستش شے کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ اللہ جس کی اطاعت وعبادت کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، وہ دانا، عاقل اور مہربان ہے۔ اور اس کا خاص وصف شفقت ورحمت ہے۔ طریق وعمل میں ایسے خدائی اطاعت ہماری زندگیوں کے انضباط پر دلالت کرتی ہے۔ قرآن کے مطابق خدا کوئی مذہبی عقیدہ (Dogma) نہیں بلکہ ایک نمونہ اور زندگی کو منضبط کرنے والی قوت ہے۔ خدا ہماری اقدار اعلیٰ کا کفیل ہے جب قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کرے یعنی عبادت اس کے حقیقی مفہوم میں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صرف قولی حمد وثنا اور اپنے فائدے کے لیے التجائیں نہ کی جائیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی کے مطابق زندگی کو ڈھالا جائے ہر اچھا کام ایک عبادت ہے اگر ہم اپنی ذات سے وفاداری کر رہے ہیں اور اپنے اہل خاندان اور ہمسایوں کے ساتھ مہربان ہیں تو ہماری زندگی عبادت گزار ہے کیونکہ ہم اپنی فطرت کے نصب العین کی تکمیل کر کے خدا کی مشیت کی اطاعت کر رہے ہیں جس کا ظہور خود ہماری فطرت میں موجود ہے۔

امن اور خوشحالی کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم خود اپنے وجود میں ہم آہنگی پیدا کریں انسان مختلف جذبات وعواطف سے سرفراز کیا گیا ہے۔ جو اس کی زندگی کے لیے تعمیری چیزیں ہیں اور محرک قوتیں ہیں ان میں بذاتہٖ شر نہیں ہے کیونکہ ایک صاحب لطف وکرم ذات شر کو پیدا نہیں کرسکتی، قرآن اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے کار پیدا نہیں کی لہٰذا انسان کی جبلتیں شیطانی قرار نہ دی جائیں۔ نہ اس کو کوئی فطری معصیت وراثتاً اپنے مورث اعلیٰ آدم سے ملی ہے۔ یہ زندگی کو بنانے کے اسباب واختیار کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اور خدا نے اس کو عمل کی متبادل صورتیں دکھلا دی ہیں وحی ربانی کے علاوہ عقل ایک امتیازی استعداد ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے تاکہ وہ اپنی جبلتوں کو اس کے تابع بناکر کام میں لائے اور انہیں خود سر اور شیطانی بننے سے روکے۔ چنانچہ ہم سکون واطمینان صرف اس وقت حاصل کرتے ہیں جب ہماری جبلتیں عقل کے تابع ہوں۔ صرف عقل وشعور کے استعمال اور نیک زندگی کے ذریعے ہم سکون وطمانیت حاصل کرسکتے ہیں۔ جو ہماری فطرت کی اندرونی خواہش ہے۔ از روئے قرآن اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ اس لیے دین اسلام کے فرائض کو بجا لانا کسی بیرونی طاقت کے سامنے جھکنا نہیں، بلکہ اپنی فطرت کے تقاضوں کو ماننا ہے جس پر خدا نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ قرآن میں نیکی کے قوانین کو خدا کے مقرر کردہ حدود سے تعبیر کیا گیا ہے یہ خود ہمارے

لیے فلاح و بہبود کے قوانین ہیں اگر کوئی نیک ہے تو خود اپنے لیے ہے اور اگر کوئی برائی کرتا ہے تو اس کا وبال بجز اس کی ذات کے کسی دوسرے پر نہیں پڑتا۔ ایک بدکردار یہ سمجھتا ہے کہ وہ فطری قوانین کے توڑنے میں آزاد ہے اور قانون کو توڑ کر یہ گمان کرتا ہے کہ اس نے اپنی آزادی کا ثبوت دے دیا لیکن وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ قانون کی شکست خود اس کی اپنی شکست ہے نیکی خود اپنی جزا اور بدی اپنی آپ سزا ہے۔

قرآن کی تعلیمات کے مطابق مذہب بجز اس کے کچھ اور نہیں کہ انسان عملاً اور مؤثر طریقہ سے خدا پر ایمان لائے۔ اس اعتبار سے اسلام ایسے مذاہب سے قطعاً مختلف ہے جن میں خدا کا کوئی واضح تصور نہیں۔ مثلاً بدھ مت اور کسی حد تک ہندو دھرم بھی وغیرہ۔ قرآن کا منشا یہ ہے کہ انسان کو خود اپنے اندر اور بیشتر کائنات میں دریافت کرے۔ اس کا فرمان یہ ہے کہ ایسا خدا حقیقتاً وجود رکھتا ہے اور نظری و عملی طور پر مشاہدہ اور عقل کے ذریعے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ہم فطرت کے قوانین سے بذریعہ ادراک و اطاعت استفادہ کر سکتے ہیں اگر ہم اپنی اخلاقی اور معاشری فطرت کو سمجھیں تو ہم ان قوانین کو بھی معلوم کر سکتے ہیں جن کی اطاعت ہماری خوشحالی کی ضامن ہوگی۔ چنانچہ اسی مفہوم میں اسلام کے معنیٰ اطاعت کرنے کے ہیں

انسان تلاش حق میں حقیقتاً خدا ہی کی جستجو کرتا ہے۔ اس لیے سچا مذہب صرف یہی ہے کہ ایک ہمہ دان اور ہمہ تواں ذات پر جو تحفظ اقدار بھی کرتا ہے، ایمان لایا جائے۔ خدا کے قوانین کو سمجھنا اور ان کی اطاعت کرنا، اور ان سے زندگی کا انضباط و اتحاد اور ترفع حاصل کرنا ہی زندگی اور تمام سچے اور صحیح مذاہب کا مقصود ہے اس کے سوا کوئی اور مذہب سچا نہیں ہوتا۔ جہاں یہ چیز پائی جائے گی وہاں خدا کی صداقت اور خدا کی سکینت ہوگی۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ جو کوئی خدا پر ایمان لاتا ہے اور اپنی ہستی کو استقامت کے ساتھ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت پر آمادہ کر لیتا ہے، وہ سچائی پاتا ہے یہی وہ لوگ ہیں جو خوف اور غم سے آزاد ہیں۔

ایمان کے اصل اصول بیان کرتے ہوئے قرآن اکثر جگہ اعمال صالحہ کو ان کے ساتھ ملا کر پیش کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کا محض لفظی اقرار یا مبہم ذہنی تصور ناکافی ہے اگر علم و رائے کے درمیان قدیم یونانی فرق کو اختیار کیا جائے تو ایسا ایمان جس سے اعمال صالحہ صورت پذیر نہ ہوں اور اس میں عمل کے لیے قوی محرک بننے کی صلاحیت نہ ہو، تو وہ محض رائے یا مبہم خیال ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہم قرآن میں مسلم اور مومن کے درمیان بھی فرق پاتے ہیں۔ مسلم وہ ہے جو عقائد اسلام کو مانتا ہے۔

اور اس کے موٹے موٹے قوانین و رسوم کی پابندی کرتا ہے اور وہ اس طرح مسلم برادری کا ایک رکن ہوتا ہے۔ ایمان اس سے زیادہ ہے۔ وہ قلب میں داخل ہو کر زندگی کو اندر سے ڈھالنا شروع کرتا ہے باطنی اعتقاد کے بغیر ظاہری پابندی کم قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اسلام خدا پر ایمان کو مذہب کا حقیقی باطن قرار دے کر اس کو پھیلاتا اور ان لازمی نتائج کو ان سے وابستہ کرتا ہے جو اس سے رونما ہوتے ہیں۔ از روئے قرآن اگر اس بنیادی ایمان سے یہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں تو پھر خود ایمان کے اندر خامی موجود ہے۔

قرآن ایک رحمٰن و رحیم رب کو ماننے کا ایک لازمی نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ اخلاقی نظام کا حقیقی و لازمی ہونا بھی ضروری ہے۔ اور اگر اخلاقی نظام ایک حقیقت ہے تو نیک و بد اعمال کے اثرات ضرور پیدا ہوں گے، جنہیں قرآن جزا اور سزا سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر زندگی جسم کے ساتھ فنا ہو جائے تو اخلاقی نظام کی کوئی حقیقت نہ ہوگی۔ اس لیے حشر و آخرت کا ہونا ایک لازمی امر ہے اور ایمان بالمعاد اسلامی عقائد کا جزو لاینفک ہے۔ بعض مذاہب شیخی بگھارتے ہیں کہ انہوں نے قانون کی بجائے محبت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ لیکن یہ مردو کی ماہیت کا غلط تصور ہے۔ قانون بلا محبت کے ظلم بن جاتا ہے۔ اور محبت بغیر قانون کے اندھی اور مہلک بن جاتی ہے۔ قانون مادی کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اگر قانون نہ ہوتا تو ایک افراتفری ہوتی۔ خدا کی رحمت مادی مخلوقات میں اپنا ظہور مثل قانون، نظام اور حسن کے کرتی ہے، اور انسان میں یہ ابتداء اپنی نمود نظام اخلاق کی صورت میں کرتی ہے۔ جرمن فلسفی کانٹ (Kant) اپنے حقیقی جذبے کا اظہار کر رہا تھا جب اس نے کہا کہ دو چیزوں نے اس پر خوف طاری کر دیا۔ اوپر تاروں بھرا آسمان اور باطن میں اخلاقی قانون، اسی لیے قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ ہم ہمیشہ خدا کی اس صفت کو ذہن نشین رکھیں کہ وہ مالك يوم الدين ہے اس نے قانون مکافات عمل جاری کیا ہے قرآن کہتا ہے کہ خیر و شر نہایت باریک بینی سے میزان حیات میں تولے جاتے ہیں۔ خواہ وہ ایک روحانی طور پر غیر تربیت یافتہ آنکھ کے لیے کتنے ہی غیر محسوس ہوں۔

OOOOOOO